اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۷، شمارہ۳، مسلسل شمارہ:۳۶۵، سال۲۰۲۲ء

قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں تقسیمِ برِصغیر کا بیانیہ

محمد سَید علی
لیکچرار اُردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

PARTITION OF THE SUB-CONTINENT
AND QURATUL AIN HAIDER'S NOVELS

Muhammad Said Ali
Lecturer in Urdu
Ghazi University, Dera Ghazi Khan

Abstract

The partition of the sub-continent is the most important and the biggest event in our history. There emerged two, and later, three independent countries namely Bharat and Pakistan in 1947 and Bangladesh in 1971. The repercussions of this division were felt in shape of migration, loss of life, wealth and honour of thousands of people. Even today, its effects are being felt and described both in prose and verse. Among others, renowned Urdu novelist Quratul Ain Haider has woven her writing especially novels around the tragedy of partition.

Keywords:
Subcontinent, Partition, Redcliffe Line, Migration, Colonialism, Pakistan, Bharat, Bangladesh,

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷۔۲۰۰۷ء) اُردو فکشن کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔اُن کے والد سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰۔۱۹۴۳ء) اور والدہ نذر سجاد حیدر (۱۸۹۴۔۱۹۶۷ء) اگرچہ رومانوی تحریک کے روح رواں تھے لیکن قرۃ العین حیدر نے ترقی پسند فکر کو آگے بڑھایا۔ان کی تحریروں میں اشرافیہ کی بدحالی اور مسلسل زوال کا نوحہ سنائی دیتا ہے۔قرۃ العین حیدر غیر ضروری تصنع کی بہ جائے معاشرے کو ویسا ہی دکھاتی ہیں جیسا وہ ہے۔انھوں نے جس عہد میں زندگی گزاری اس میں تقسیمِ برصغیر اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے دو اہم واقعات پیش آئے۔اس لیے ان کی تحریروں میں جہاں برِصغیر بالخصوص لکھنؤ، علی گڑھ، میرٹھ، دکن اور دلی شہر کی معاشرت، یہاں کی ہندو مسلم تہذیب کا گھال میل، آپسی رشتہ داریاں، بھائی چارہ اور عظیم روایات ملتی ہیں وہاں اس تہذیب کا زوال اور یہاں کے لوگوں کا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا نوحہ بھی ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول، ناولٹ، افسانہ، رپورتاژ، سفر نامہ اور خاکہ نگاری الغرض افسانوی اور غیر افسانوی نثر ہر دو میدان میں قلم کا جادو جگایا۔ان کے ناولوں میں **میرے بھی صنم خانے**، **سفینۂ غمِ دل**، **آگ کا دریا**، **آخرِ شب کے ہمسفر**، **گردشِ رنگِ چمن**، **چاندنی بیگم** اور ایک سوانحی ناول **کارِ جہاں دراز ہے**، جب کہ ناولٹوں میں **سیتا ہرن**، **چائے کے باغ**، **دلرُبا**، **ہاؤسنگ سوسائٹی** اور **اگلے جنم موہے بِٹیا نہ کیجو** شامل ہیں۔قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعوں میں **ستاروں سے آگے**، **شیشے کے گھر**، **پت جھڑ کی آواز**، **روشنی کی رفتار**، چار جلدوں پر مشتمل کُلیات **جہاں آئینہ**، رپورتاژ میں **فصلِ گل آئی یا اجل آئی**، **قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے**، **ستمبر کا چاند**، جب کہ سفر ناموں میں **لندن لیٹر**، **گل گشت**، **جہانِ دیگر**، **کوہِ دماوند** اور **دِکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار** شامل ہیں۔انھوں نے خود کو مترجم، مدوّن، نقاد اور مدیر کے طور پر بھی منوایا۔ادبی خدمات پر قرۃ العین حیدر کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، پدم شری ایوارڈ اور غالب ایوارڈ کے ساتھ ساتھ بھارت کا سب سے بڑا سِول اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' بھی مل چکا ہے۔(۱)

تقسیمِ برِصغیر ہماری تاریخ کا سب سے اہم اور سب سے بڑا واقعہ ہے۔اس کے نتیجے میں ہندوستان پہلے پہل دو اور بعد ازاں تین ٹکڑوں میں بٹ گیا۔اس واقعے نے برصغیر کی سیاست، سماج اور

ثقافت کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت اور فسادات کی وجہ سے کروڑوں انسانوں نے اپنی جان، مال اور ناموس گنوائی۔ تقسیم ہونا چاہیے تھی کہ نہیں، اس کے اصل محرکات کیا تھے، اس نے سماج اور ثقافت کو کس حد تک متاثر کیا اور آنے والی نسلوں پر کیا اثرات چھوڑے؟ اِن سب سوالوں کے جواب قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں دیتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے سات ناول لکھے۔ سبھی ناول بنگال، بہار اور یو پی بالخصوص اودھ کی ہزار سالہ تہذیبی تاریخ کے ذریعے بٹوارے کا فیصلہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اصل محرکات کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول **میرے بھی صنم خانے** ۱۹۴۹ء لکھنؤ کے ہندو اور مسلم راج گھرانوں کی تہذیبی زندگی، نوجوان نسل کی آزادی کے لیے جدوجہد، بٹوارا، ہجرت اور فسادات اور شر نارتھی کیمپوں کی کہانی ہے۔ اس ناول کا عنوان **بالِ جبریل** میں شامل اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء) کے ایک شعر سے لیا گیا ہے۔(۲) کہانی میں غفران منزل اور کرواہاراج کے جاگیر دار کنور عرفان علی خاں، کنور رانی سلطنت آرا بیگم، خوب صورت بیٹی رخشندہ، پولو اور پی چو، جب کہ امیر پور راج کے سربراہ سیّد مرتضیٰ حسین، جمیلہ سلطان، ڈائمنڈ اور ہندو گھرانے کے کرن، گنی کول اور انگریزوں میں کرسٹابل قابل ذکر کردار ہیں۔ نئی نسل ایک دوسرے سے محبت کرتی ہے اور ذات پات، خویش قبلہ کی پروا کیے بغیر آپسی شادیوں تک کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ایسے میں کچھ سیاسی عناصر نے بٹوارے کی بات چلادی۔ ہندوستان میں جگہ جگہ فساد شروع ہو گئے۔ مہاتما گاندھی (۱۸۶۹۔۱۹۴۸ء) مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر کڑھتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔۱۹۵۸ء) بٹوارے کے خلاف لڑتے رہے:

> ''خدارا اسے نامنظور کردو۔ ملازمتوں کے مسلمانوں کو اوپٹ آؤٹ کرنے سے کسی طرح روکو۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز اب بھی مان لو۔ یہ غلط ہے کہ ۳ جون کے اعلان کے علاوہ اب ہمارے سامنے کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔۔۔ اب بھی موقع ہے۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہم صدیوں تک نہ سنبھل سکیں گے لیکن ان سے کہا گیا کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اگلے روز ریڈیو پر اعلان کر دیا گیا کہ ۳ جون کا پلان منظور کر لیا گیا۔ دو الگ الگ ریاستیں قائم کر دی گئیں۔ باؤنڈری کمیشن بٹھا دیا گیا۔ باؤنڈری فورس تیار کر لی گئی۔ خدا کے انسان باہمی نفرت کی اتاہ خلیج کے دونوں طرف بٹ گئے۔''(۳)

لیکن تقسیم کا نقارہ بجادیا گیااور بچپن کے دوست جنھوں نے کبھی مذہب اور قبیلے کو مسئلہ نہ بنایا تھااچانک ان چاہی تقسیم کے سبب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

دوسرا ناول **سفینۂ غمِ دل** ۱۹۵۲ء، اَپر کلاس کے عیسائی، ہندو اور مسلم گھرانے کی تقسیم سے پہلے ایک ساتھ رہنے اور تقسیم کے بعد ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جانے کی کہانی ہے۔ تینوں خاندان بنارس، لکھنؤ اور نواح میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں کے ساتھی ہیں۔ ان کے بچے جو بہ تدریج بڑے ہو رہے ہیں بلا تفریق مذہب، ایک ہی تہذیب کے پروردہ اور ایک ہی ثقافت لیے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں، سیر و تفریح کرتے ہیں۔ پارٹیاں، رت جگے اور ایک دوسرے کے لیے گہری محبت بھی رکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے بیاہ کے بھی خواہش مند ہیں۔ لیکن تقسیم ان کے ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ خون، آگ اور آندھیوں کا سیلاب انھیں بہالے جاتا ہے اور انھیں ان کی دھرتی لکھنؤ، علی گڑھ اور بنارس سے کراچی، بمبئی، دہلی اور انگلستان لے جاتا ہے۔

پاکستانی فوج کا بر گیڈیئر فواد نسیم احمد جسے اپنا جان سے پیارا وطن بنارس چھوڑ کر بیگانے ملک جانا پڑ رہا تھا، جواب اُس ملک کی حفاظت کرے گا اور ہو سکتا ہے خود اپنی سرزمین، اپنی مرحوم سرزمین کے خلاف اسے لڑنا پڑے۔ ویسے بھی سرزمین کی تباہی انھی کے ہاتھوں لکھ دی گئی تھی۔ اب ان کے مقدر میں فقط بے سکونی تھی:

> ''اس کے اور میرے وطن کی یہ آخری مشترکہ رات تھی جو میں نے وہاں گزار دی۔ اس کے بعد اور راتیں آئیں گی اور دن۔۔۔ لیکن وہ وطن مرحوم کی نئی سرحدوں کے دونوں جانب جداگانہ حیثیت سے طلوع ہوں گے۔۔۔ ابا جان آپ نے بالکل غلط کہا تھا کہ بنارس کی صبحوں اور موسم کی ان کیفیتوں کو کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا یہ ہماری اپنی ہیں۔ اور ہمارے وجود کی کیفیت کا ایک لازمی جزو ہیں۔ ابا میاں آپ کے تو انقلاب کے سارے خواب بھی کچھ غلط ہی ثابت ہوئے۔۔۔ ہمارے اور اس مٹی کے درمیان جس میں سے آپ پیدا ہوئے اور جس میں آپ کو چھپا دیا گیا ہے اب ہزاروں میل کا فاصلہ اور صدیوں کی تنہائی کا بُعد ہو گا۔ اب ہم ایک دوسرے کے لیے غیر ملکی ہیں۔۔۔ یہ لوگ جو ترک وطن پر مجبور کر رہے ہیں؟ تم نے ان کو کیوں نہ بتایا کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال کر انھوں نے زندگی کے ابدی سکون کو زندگی سے بے دخل کر دیا ہے۔''(۴)

اس ناول کا عنوان فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱۔۱۹۸۴ء) کی نظم ''صبحِ آزادی-اگست ۴۷ء'' کے ایک مصرع سے لیا گیا ہے۔(۵)

قرۃ العین حیدر کا ناول **آگ کا دریا** ۱۹۵۸ء برِ صغیر کی ڈھائی سے تین ہزار برس کی تہذیب کا عکاس ہے۔اس ناول کا عنوان جگر مراد آبادی(۱۸۹۰۔۱۹۶۰ء) کے مشہورِ زمانہ شعر سے لیا گیا ہے۔(۶)ناول کی کہانی کو چار حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر اور چمپاوت ہر حصے میں مرکزی کردار کے طور پر آئے ہیں۔ دوسرے حصے سے ایک عرب مسلمان کمال الدین بھی کہانی میں مرکزی حیثیت سے آیا ہے اور آخر تک رہا ہے۔ جب کہ تیسرے حصے میں انگلستان سے کلکتہ آنے والا نیل کا تاجر سرل ایشلے بھی مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یوں بہت سے کرداروں کے ساتھ یہ پانچ کردار کہانی کی جان ہیں۔

کہانی کا آغاز گوتم نیلمبر سے ہوتا ہے جو گرو پرشوتم کا برہمن شاگرد، ایک عالم، کلاکار اور امن پسند برہم چاری ہے۔ مگر اسے راج گرو کی لائق، حسین اور رقص کی ماہر بیٹی چمپک (چمپاوت) سے عشق ہو جاتا ہے۔ برہم چار اور دنیا تج دینے والا گوتم اچانک فطرت کے حسین مناظر اور عورت کی تصویریں بنانے لگ جاتا ہے۔ مگر دھرتی ماں پاٹلی پتر (ایودھیا، اُتر کوشل) پر ایک راجا چندر گُپت کے اچانک حملے اور ظلم و ستم میں گوتم جنگ کرتے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گنوا بیٹھتا ہے۔ وہ قاتل، برہم چاری، عالم، فلسفی اور مصور گوتم، اب ناٹک کا بڑا کلاکار ہو چکا تھا۔ کئی حسینائیں اور ذہانت کی دیویاں اسے چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنی بچھڑی محبت شاہ زادی چمپک کو ڈھونڈتا رہا۔ پھر ایک دن ناٹک دیکھنے والوں میں چمپک، ایک چھوٹا سا بچہ گود میں لیے، اسے مل گئی۔ وہ راجا چندر گُپت کے ایک بدھے سے بوڑھے فوجی سے بیاہی گئی تھی۔ گوتم اسی صدمے میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور ندی پار کرتے ڈوب کر مر گیا۔

دوسرے حصے میں صدیوں بعد گوتم کی قبر پر ایک مسلمان عرب فلسفی لڑکا کمال الدین ایودھیا کی جواں سال چمپا کے عشق میں مبتلا کھڑا ہے۔ یہ کوئی فوجی عرب نہیں، بل کہ سلطان حسین شرقی کے کتب خانے کا نگران ہے۔ یہ زمانہ کاشی کے بھگت کبیر داس کا ہے۔ زمانے پر کبیر کا اثر ہے۔ محمود غزنوی(۹۳۱۔۱۰۳۰ء)، قطب الدین ایبک(۱۱۵۰۔۱۲۱۰ء) اور کئی مسلم بادشاہوں کے حملوں کے

بعد حسین شرقی نے امن اور علم کو ترویج دی اور ڈیڑھ ہزار سال پہلے سنسکرت کے پنڈتوں کے تان پتر کا فارسی ترجمہ کرنے کے لیے کمال الدین کو ایودھیا بھیجا۔ اس تحقیق کے دوران کمال ایک پنڈت کی بہن اور کبیر داسی چمپاوتی کے عشق میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ مگر جب سلطان سکندر دلی پر قابض ہوا اور حسین شرقی دربہ در ہوا تو کمال بھی چھپتا چھپاتا اور صوفیہ سے فیض پاتا بنگال جا پہنچا۔ فنِ موسیقی کا ماہر یہ کبیر بھگت ایک بنگالی لڑکی شنیلا (آمنہ) سے بیاہ رچا کر آدھی صدی تک وہاں رہنے کی وجہ سے مکمل بنگالی ہو گیا۔ مگر ہمایوں کی فوج میں شامل اس کے فن کار بیٹے کے سبب اسے غدار کہہ کر قید کر لیا گیا۔ وہ اپنے دیس اور اپنی دھرتی سے، جہاں اس کی بیوی کی قبر تھی، غدار بن کر نکالا گیا اور مار دیا گیا۔

تیسرا حصہ صدیوں بعد مغل حکومت کے زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی (۱۶۰۰۔۱۸۷۴ء) کے دور کی کہانی ہے۔ تختِ دہلی پر کٹھ پتلی مغل بادشاہ عالم گیر ثانی (۱۶۹۹۔۱۷۵۹ء) بیٹھا ہے۔ سرل ہارڈول ایشلے انگلستان سے دولت مند ہونے کا خواب سجائے جہاز سے کلکتہ اُترا۔ کلکتہ، اب انگریز تاجروں کا مسکن و مرکز، فورٹ ولیم کالج اور دیگر عمارات کے ساتھ ہندوستان کا نمایاں ترین شہر تھا۔ جہاں رہ کر سرل ایشلے (نیل کا تاجر) بے پناہ دولت مند اور سیاسی اثر و رسوخ بنا چکا تھا۔ اس نے کئی اینگلو انڈین اور بنگالی ہندوستانی لڑکیوں سے تعلق بنائے۔ ایک بنگالی ہندو لڑکی شنیلا کو رکھیل بنایا اور اب لکھنؤ کی معروف طوائف چمپا بائی سے چکر چلا رہا تھا۔ لکھنؤ کا ابوالمنصور کمال الدین (نواب کمن) بھی چمپا بائی کو چاہتا تھا۔ شنیلا نے ایک کلرک گوتم نیلمبر کے ہاتھ چمپا بائی کو سرل ایشلے سے دور رہنے کی درخواست بھیجی تھی۔ مگر چمپا بائی اس پیام بر (گوتم نیلمبر) کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ گوتم اسے لکھنؤ چھوڑ جب کلکتہ پہنچا تو شنیلا مر چکی تھی۔ کچھ عرصے بعد سرل ایشلے بھی مر گیا اور اس کی انگریز بیوی اور بیٹا (جونیئر سرل) انگلستان چلے گئے۔ سرل جونیئر نے بے پناہ دولت سے کاروبار کر کے اتنی شہرت پائی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد پورے ہندوستان پر ملکہ برطانیہ کی حکومت تھی اور اب ہندوستان سرل ایشلے کے بیٹے لارڈ سرل ایڈون ایشلے کا تھا۔ پھر جب ۱۸۷۱ء میں کلکتہ کا مشہور اخبار نویس گوتم نیلمبر اپنے بیٹے سے ملنے لکھنؤ گیا تو نواب کمن (کمال) فوت ہو چکا تھا۔ نواب صفدر جنگ (۱۷۰۸۔۱۷۵۴ء) کی اودھ حکومت کا آخری چراغ نواب واجد علی شاہ (۱۸۲۲۔۱۸۸۷ء) بھی گل ہو چکا تھا اور لکھنؤ پر انگریز حاکم تھا۔ لکھنؤ کی ایک سڑک پر اسے مسلسل جنگوں

اور بگڑتے حالات کی ماری ہر دل عزیز چمپا بائی ایک بھکارن کے روپ میں ملی۔ مگر تانگے والے نے اس افیونی عورت کو بھیک نہ دینے کی سفارش کر دی۔ لکھنؤ کی ہر دلِ عزیز طوائف کا زوال دراصل لکھنؤ کا زوال تھا۔اور پھر گوتم نیلمبر کی موت پر یہ حصہ بھی اختتام کو پہنچتا ہے۔

کہانی کا چوتھا حصہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔اس وقت بہت سے کردار ۱۹۵۴ء میں لندن میں بیٹھے لکھنؤ کے بیتے دنوں اور زمانہ طالب علمی کو یاد کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ ضلع بنارس کے صدر کی اکلوتی خوبرو بیٹی چمپا احمد لکھنؤ کے ازابلا تھوبرن کالج میں پڑھنے آئی تو گل فشاں کوٹھی کے مکین خان بہادر تقی رضا کی اولاد کمال، تہمینہ اور طلعت سے دوستی ہو گئی۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کے ہندو مکین ہری شنکر اور اس کی بہنیں نرملا اور لاج بھی ان کے حلقہ احباب میں تھے۔ تہمینہ کا منگیتر اور چچازاد عامر رضا تو چمپا احمد کے حُسن کا گرویدہ ہو کر منگنی ہی توڑ بیٹھا۔ پھر عامر رضا نیوی میں افسر ہو گیا۔لاج بیاہی گئی اور نرملا کی منگنی گوتم نیلمبر سے ہو گی۔ گوتم بھی چمپا احمد کا دیوانہ ہوا لیکن چمپا نے لحاظ کے مارے دوسروں کے منگیتروں کو خود سے دور رکھا۔

کانگریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت کی ہندو اکثریت کا غلبہ ہوا تو مسلمانوں نے اپنی الگ جماعت مسلم لیگ بنالی۔ ہندوستانی کسانوں نے دھوتی پہنے گاندھی جی کو اپنے جیسا اور صوفی سادھو سنتوں جیسا سمجھا اور ان کی بات کو سمجھنے لگے۔ نہرو (۱۸۸۹ء۔۱۹۶۴ء)سوشلسٹوں کے آئیڈیل ہوئے اور قائدِاعظم (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) مسلمانوں کی آخری امید۔ برطانوی حکومت جن جن صوبوں پر حاکم تھی ان کی حالت لگان اور بدانتظامی کے سبب بدتر اور قحط زدہ تھی۔ان میں بنگال، بہار، اُڑیسہ اور مدراس شامل تھے۔ یوپی میں بھی حالت اچھی نہیں تھی۔ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کے تسلط میں آیا اس لیے وہ نسبتاً خوش حال تھا۔ حیدرآباد اور دیگر ریاستیں خود مختار ہونے کی وجہ سے خوش حال تھیں۔ نت نئی سرکاری پالیسیاں، ڈھیر سارا لگان اور مشینوں کی درآمد نے زراعت اور گھریلو صنعت کاری کو خاصا نقصان پہنچایا۔ رہی سہی کسر قحط نے نکال دی اور لوگ انگریز حکومت کے خلاف بغاوت پر مجبور ہو گئے۔ قحط زدہ کسانوں نے سوراج کا مطلب کاشتکاری نظام میں بہتری جانا۔اس لیے آزادی کے لیے بڑھ چڑھ کر کوششیں کرنے لگے۔ لیکن انگریز نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت بٹوارے پر زور دیا۔ اس نے

جہاں ہندو مسلم میں پھوٹ ڈالی، وہاں انگریز تاریخ دانوں نے امن پسند ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کا ازلی مخالف اور دو الگ الگ قومیں، حکومت کے جوہر سے عاری غلام بتایا۔

بالآخر انگریز کی چال، کانگریس اور مسلم لیگ کی لڑائی نے بٹوارا کرا ہی دیا۔ عامر رضا نیا ملک، نیا عہدہ اور ترقی پانے کی غرض سے پاکستان چلا آیا۔ ہندو اور مسلمان دوست ہندوستان پاکستان میں بٹ گئے۔ قرۃ العین حیدر ۱۹۴۷ء کے بٹوارے اور فسادات کو مہابھارت سے جوڑتی ہیں، جہاں بھائی آپس میں لڑتے ہیں اور خاندان کے خاندان بٹ جاتے ہیں۔ ۴۷ء میں بھی کچھ یہی ہوا۔ کچھ خاندان ایک دوسرے سے جدا ہو کے ہجرت کر گئے اور کہیں تو ایک ہی گھر سے بہن بھائی، ماں باپ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ کچھ نظریات اور ذہنی فرق کی وجہ سے، کچھ زمینوں کو نہ چھوڑنے کی وجہ سے، کچھ نئے ملک میں نئے عہدے، ڈھیر ساری زمینوں اور ترقی پانے کی غرض سے، کچھ عقیدے سے مجبور، کچھ بے خبر رہ رہے تھے یا بے خبر ہجرت کر گئے تھے۔

چمپا احمد یونیورسٹی سکالرشپ پر فرانس چلی گئی۔ طلعت اور نرملا کیمبرج میں پڑھنے گئیں تو چمپا احمد، ہری شنکر، گوتم، کمال رضا، عامر رضا اور پاکستانی اعلیٰ افسر کی بیٹی روشن آرا بھی لندن میں اکٹھے ہو گئے مگر وہ اب مختلف ممالک کے باشندے تھے۔ تقسیم سے پہلے اتنے قریب اور ساتھ رہنے والے اب اپنی الگ الگ زندگی میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی ضرورتیں، جذبات، مقاصد اور نظریات، سبھی بدل گئے تھے۔ اگرچہ ان میں اب بھی کہیں محبت کی چنگاری باقی تھی مگر سب کسی چالاک اداکار کی طرح پیش آتے۔

چمپا احمد، لندن کی ہندوستانی کمیونٹی کے کچھ گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مل کر گربہ کھیلتی ہے تو اس کے ذہن سے محو ہو چکی تقسیمِ ہندوستان تازہ ہو جاتی ہے اور وہ دھرتی ماں کے یوں حصے بخرے ہونے پر افسوس کرتی ہے:

"ہے گووند راگھو چرن اب تو جیون ہارے
سندھ کے کنارے ، سندھ کے کنارے

لڑکیوں نے دہرایا۔ ناچتے ناچتے اس کے دل پر چوٹ لگی۔ سندھ؟ سندھ تو پاکستان میں ہے؟ پھر اسے دفعتاً یاد آیا، یہ حقیقت ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ دو قومیں ہیں۔ میں مسلمان ہوں اس لیے قابلِ نفرین ہوں؟ یہ لوگ ہندو ہیں اس لیے گردن زدنی ہیں؟

پنجاب شندھو گجرات مراٹھادراوڑا تکل ونگا۔۔۔ کیا بکواس ہے۔ میں تو ہمیشہ ٹیگور کی اس رومان پرستی کی مخالف رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اور یہ لوگ دو مختلف قومیں ہیں۔ مگر میں ہندوستانی ہوں۔ اس سے کیا ہوا؟ مسلمان تو ہوں اور کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان دل سے پاکستانی ہوتا ہے۔"(۷)

لندن میں پڑھنے والے کیمبرج کے یہودی طالب علم مائیکل، مسلمان روشن آرا اور ہندو سُریکھا آپس میں بٹوارے پر بحث کرتے ہیں۔ جب روشن آرا، مائیکل کو فلسطینی مسلمانوں کو بے دردی سے مارنے اور ان کی دھرتی یروشلم سے بے دخل کرنے کا طعنہ دیتی ہے تو مائیکل اسے جواب دیتا ہے کہ پاکستانیوں نے بھی تو ہندوؤں کے ساتھ اسرائیل جیسا سلوک کیا:

" تمھاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ بنالیا تو ہم کیوں گردن زدنی ہو گئے؟'
'تم..... تم نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔' 'تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔" (۸)

چمپا کی زندگی میں تین لوگ شدت سے آئے عامر رضا، گوتم نیلمبر اور اب سرل ایشلے (تھرڈ)، مگر کسی نے بھی اس خوب صورت لڑکی سے بیاہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھی ہوتی گئی۔ نرملا پھیپھڑوں کی دَق سے مر گئی۔ تہمینہ یوپی کے ایک زراعت آفیسر کے ساتھ بیاہی گئیں اور لالچی عامر رضا نے کسی امیر پاکستانی لڑکی سے شادی رَچالی۔

پھر کمال رضا، ہری شنکر، مائیکل، سُریکھا اور طلعت سبھی انگلستان چھوڑ ہندوستان پاکستان اور اپنے اپنے دیش لوٹ گئے۔ سرل ایشلے انگلستان سے پاکستان میں چائے کا کاروبار کرنے آیا تو وہ اور کمال رضا، بنگال اور ہندوستان جاتے ہیں۔ گھومتے ہیں، مشاہدات کرتے ہیں اور اپنی گزری دنیا کی دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھنؤ واسی لکھنؤ کو ویران قبرستان کر کے چلے گئے تھے۔ صرف چمپا احمد اس سارے کی وارث وہاں موجود تھی۔ وہ بنارس، لکھنؤ، پیرس، لندن اور روم گھوم آنے کے بعد تھک کر اب مراد آباد میں آن بیٹھی تھی اور اپنے امام باڑے، رسم و رواج اور تہذیب سنبھالے ہوئے تھی۔ چمپا احمد نے سراغ پالیا تھا کہ دنیا کی ہر آسائش اپنے وطن، اپنی دھرتی اور اس کی آب و ہوا اور ثقافت کے سامنے ہیچ

ہے۔اس موڑ پر آ کر کمال کو تقسیم کا فیصلہ ترقی میں رکاوٹ لگا۔ چمپا احمد ہندوستان میں سب کے ساتھ اور اپنی مٹی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی لیکن وہ اپنی دھرتی اپنے ماحول اپنی رسموں اور اپنے لوگوں سے کٹ کر دور دیس میں جا بسا تھا۔ وہ کٹی پتنگ تھا جس نے خود کو ہوا کے دوش پر ڈال دیا تھا۔ جانے اس کا مقدر اور مستقبل کیا تھا اور جانے اس تیز ہوا نے اسے کہاں جا پھینکنا تھا؟ جانے پھر اڑنا اس کا مقدر تھا کہ نہیں.....ڈور تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے کٹوا بیٹھا تھا۔

بٹوارے نے عجب تماشا کیا تھا۔ لاج اب اکیلی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمال پاکستان جائے۔ نرمل بیماری سے مر گئی تھی اور شنکر مغرب میں چلا گیا تھا۔ وہ سب اسے اکیلا کر کے سرحد پار کہیں چلے گئے تھے۔ چلے جانے والے الگ مصیبت میں تھے۔ مہاجر، اپنی دھرتی کو دیکھنے ہندوستان جاتا تو پاکستانی جاسوس غدار کہلاتا اور پاکستان پلٹ کر آتا تو شک بھری نظروں کی خاموش پکار ہندوستانی جاسوس! غدار! غدار!! الاپتی۔ وہ تو اب اِدھر کا رہا تھا نہ اُدھر کا۔

گوتم نیلمبر، شاکیا مُنی کا گوتم نیلمبر، صدیوں سے ہندوستان کا باسی ہے۔ پھر محمود غزنوی کے دور میں اس کی قبر پر ابوالمنصور کمال الدین نامی ایک عرب، مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ آیا۔ وہ ہندوستان کی دھرتی میں رچا بسا۔ دھرتی نے اسے اپنایا۔ اس نے یہاں کی بیٹی سے بیاہ رچایا۔ بچے پیدا کیے ہیں۔ یہاں کی مٹی میں اس قدر مل گیا کہ اب الگ سے پہچانا نہ جاتا تھا۔ پھر تخریب نے آہستہ آہستہ اسے مٹی سے الگ کرنا شروع کیا۔ چناں چہ وہ اپنی زمین الگ بانٹ کر بیٹھ گیا۔ مسلمان کی الگ زمین۔ کمال الدین، جو ایک وقت ہندوستان میں آیا تھا، صدیوں بعد اسی طرح اس دھرتی سے چلا گیا۔ اس نے کبھی اس دھرتی کو اپنا نہ جانا تھا:

> ''ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔''(۹)

اس دھرتی کو اگر کسی نے اپنی مانا تو وہ صدیوں سے یہاں بستا آیا گوتم نیلمبر تھا، جو دھرتی ماں کا حقیقی بیٹا تھا۔ تو اَب دھرتی ماں بھی ہمیشہ اس کا ساتھ دے گی اور اسے کبھی گرنے نہیں دے گی کیوں کہ اس کی جڑیں اِس دھرتی میں مضبوطی سے پیوست ہیں:

"گوتم نے ایک الٹی ہوئی ناؤ پر پیر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔۔۔اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا: زمین، تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔"(۱۰)

اختتام ایک گہرے طنز پر کیا گیا ہے۔ ہزاروں برس سے یہاں رہتے آئے مضبوط جڑوں والے ہندو دھرتی ماں سے جُڑے رہے۔ مگر دس صدیاں پہلے آئے کم زور جڑوں والے مسلمان اس سے جدا ہو گئے۔ انگریز جو ڈیڑھ صدی پہلے حاکم ہوئے تھے، وہ تو پہلے ہی اِسے کرایے کی زمین کی طرح چھوڑ چکے تھے۔

اِس ناول میں قرۃ العین حیدر نے اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ اجودھیا(ربّ کا گھر) تھا۔ دھرتی کی ابتدا سے چلا آنے والا رام جی اور نوابوں کا یہ شہر، اُجڑنے کے باوجود اپنی جڑوں کو نہیں چھوڑ پایا تھا۔ اس میں بہ تدریج ظاہری تبدیلی ضرور ہوئی مگر اس کا باطن وہی قدیم اور کھرا تھا۔ ہندوستان میں مرحلہ وار تبدیلی دکھانے اور بدلتا منظر نامہ بتانے کے لیے یہ شہر سب سے مناسب و موزوں تھا اور یوں بھی قرۃ العین حیدر اس شہر کے ماضی و حال کو دوسرے شہروں سے کہیں بہتر جانتی تھیں۔

آخر شب کے ہمسفر ۱۹۷۹ء قرۃ العین حیدر کا چوتھا ناول ہے۔ اس ناول پر مصنفہ کو بھارت کا سب سے بڑا ادبی اعزاز "گیان پتھ ایوارڈ" دیا گیا۔(۱۱) ناول کا عنوان فیض احمد فیض کی مشہور غزل کے مقطعے سے لیا گیا ہے۔(۱۲) اس ناول میں انھوں نے بنگال کی کمیونسٹ (بائیں بازو کی انقلابی) تحریک کو بیان کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کا اندولن، مطالبہ پاکستان تقسیمِ ہند اور قیامِ بنگلا دیش اس کہانی کا موضوع بنے ہیں۔ ڈھاکا کالج کے طلبہ، اساتذہ اور نوجوان لڑکے لڑکیاں کمیونسٹ انقلابی تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ محنت کشوں کا استحصال کرنے والے حکومتی عناصر کے خلاف اور ہندوستان کی آزادی کے لیے امن اور تشدد ہر دو راستے اپناتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے شہید ہوتے ہیں۔ کئیوں کو آزادی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ مگر مسلمانوں کی جدوجہد فقط آزادی تک محدود نہیں رہتی۔ وہ ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کے ناروا سلوک نے انھیں یقین دلایا ہے کہ اس آزادی کا مطلب غلامی کی منتقلی (غلامی در غلامی)

ہو گا۔اس لیے وہ انگریزوں سے آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی الگ خود مختار ریاست کی مانگ بھی کر رہے ہیں۔ہندو اور آزادی پسند کمیونسٹ پارٹی بٹوارا نہیں چاہتی۔

لیکن آزادی کے خواب کی تعبیر کچھ اور ہی انداز سے سامنے آئی۔ہندوستان کا بٹوارا ہوا۔پھر جو پیس سال بعد پاکستان بھی تقسیم ہوا اور برصغیر تین ٹکڑوں (ہندوستان، پاکستان، بنگلادیش) میں بٹ گیا۔

آزادی کے متوالے کمیونسٹ، ناول کے ہیرو ہیروئن ریحان الدین احمد، دیپالی سرکار اور دیگر مرکزی کردار، اب اپنے اپنے مفاد کے لیے ہندوستان، پاکستان اور بنگال میں جی رہے ہیں۔ جن قدروں کے خلاف کبھی انھوں نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا، وہی قدریں اب خود ان کی ہڈیوں میں رچ بس گئی ہیں۔ چناں چہ وہ اب ایک دوسرے پر الزام تراشیوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ہاں ایک نئی نسل ہے جو اب ماضی و حال کی غیر جانب دار منصف ہے۔ ریحان الدین احمد کی بھانجی ناصرہ نجم السحر کا ماننا ہے کہ پہلے پہل محمد علی جناح نے ہندوستان کو بانٹا اور پھر اس دراڑ نے بٹوارے کو مزید راہیں دیں۔ برصغیر تین حصّوں میں تقسیم ہوا، اور کتنے حصے اب بھی خود مختاری کے لیے ڈائیلاگ اور تشدد ہر دو راستے اپنا رہے ہیں۔ لیکن ناصرہ نجم السحر اِس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی مسلم دشمنی، تخریب کاری اور دہشت پسندی پر بھی بات کر جاتی ہے جس نے مسلمانوں کو بٹوارے پر مجبور کیا:

> ''اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا تو آج بنگلادیش بھی نہ ہوتا۔۔۔ 'مدر انڈیا' کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو تخریب پسند کالی کے روپ میں شکتی کی پوجا کرتے تھے اور دیبی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔اور ان اوّلین دہشت پسندوں میں جن کو انگریزوں نے ٹرِرسٹ کہا اور ہندوستانیوں نے انقلابی.....کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔۔۔ 'بھدرالوگ' کی سیاست اور 'مسلم اشراف' کی سیاست کے CROSS-CURRENTS نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلادیش۔۔۔''(۱۳)

یہ ایک ایسی دھرتی کی غیر جانب دار بیانیہ رکھنے والی کہانی ہے جو ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے بنگلادیش کہلائی۔ وہ دھرتی جس نے برصغیر کے دیگر حصوں کی بہ نسبت دو بار بٹوارا، ہجرت اور فسادات دیکھے۔اس ناول کے کردار کہانی کے مطابق نہیں بل کہ کہانی کرداروں کے مطابق بولتی ہے اور یہی بیانیے کو مضبوط بناتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول **کارِ جہاں دراز ہے** ۱۹۷۷ء تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ۷۴۰ عیسوی سے ۱۹۴۷ء کی ہجرت تک کے واقعات اور تاریخ بیان ہوئی ہے۔ دوسری جلد میں تقسیم، ہجرت کے واقعات، دہرہ دون، لکھنؤ اور بلند شہر سے اعزہ واقارب اور اپنی ہجرت اور فسادات کے مختصر واقعات بتا کر پاکستان کے شہر لاہور اور کراچی کی زندگی، عزیزوں اور ادیبوں کا ذکر کرتی ہیں اور تقسیم کے واقعات سناتے ہوئے کچھ انکشافات بھی کرتی جاتی ہیں۔ بٹوارے اور پاکستان کے حوالے سے راجا صاحب محمود آباد (۱۹۴۱۔۱۹۷۳ء) اور قائد اعظم محمد علی جناح کا مکالمہ درج کرتی ہیں کہ کس طرح مملکتِ خداداد بنانے والے دیگر مسلمانوں اور ان کے عظیم قائد کی سوچ اور فکر میں اختلاف تھا:

> ”تقسیم سے چند روز قبل نئی دلی اور اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے۔ ڈنر کی میز پر راجا صاحب نے قائد اعظم سے دریافت کیا پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا؟ قائد اعظم مرحوم نے پوچھا آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔ راجا صاحب نے جواب دیا اسلامی۔ اور ملت کا سب سے زیادہ دیانت دار متقی عالم باعمل صالح ترین شخص ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے۔۔۔ قائد اعظم نے ارشاد کیا تم بیسویں صدی میں قرونِ وسطیٰ کا تصور کر رہے ہو۔ پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگی۔“(۱۴)

پھر راجا صاحب عراق چلے گئے اور تادمِ مرگ وہیں پر رہے۔ لیکن طرفہ تماشا یہ کہ رانی صاحبہ اور بیٹا دونوں لکھنؤ میں رہے۔ انھوں نے نہ پاکستان ہجرت کی اور نہ ہی راجا صاحب کے ساتھ عراق گئے کیوں کہ وہ قوم پرست ہندوستانی تھی۔ یوں تقسیم نے عجب تماشے دکھائے۔

تیسری اور آخری جلد میں ۱۹۶۲ء سے زندگی کے آخری ایام تک کے چیدہ چیدہ واقعات، کانفرنسیں، ادبی واقعات، خطوط، مختلف نظریات اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیال، مختلف یورپی ممالک کا سفر، ماضی اور آج کی صورتِ حال، مستقبل پر تشویش کا اظہار ملتا ہے۔ اس ناول کا عنوان علامہ محمد اقبال کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔(۱۵)

ناول **گردشِ رنگِ چمن** ۱۹۸۴ء میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان بالخصوص اودھ کی سوا دو سو برس کی تاریخ بیان کی ہے کہ کس طرح مسلمان سلاطین اور نوابین کی عیاشیاں سلطنت کی تباہی کا

باعث بنیں اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کس طرح بہ تدریج انگریزی تسلط قائم ہوا۔ پھر آزادی کی تحریک اور تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت نے بہت سے زمین داروں، جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کو اپنی دھرتی اور جاگیریں چھڑوادیں۔ بہت سے زمین داروں نے اس لیے ہجرت کی کہ کانگریس زمین داری کا خاتمہ کر رہی تھی جب کہ پاکستان میں زمین داری اور جاگیرداری جوں کی توں قائم تھی۔ بل کہ ہندوؤں کی چھوڑی زمینوں پر قبضہ کر کے جاگیر میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح تقسیم سے تہذیب کے ساتھ لوگوں کے اسٹیٹس بھی بدل گئے۔ بہت سی طوائفیں اور گانے والیاں متمول اور خوش حال ہو گئیں۔ کنگال مالامال اور امیر بے سر و ساماں ہو گئے۔

دھان پور کا نواب دل شاد علی خان، نور ماہ خانم سے لکھنؤ اور ہندوستان کی یادیں بانٹتا ہے جسے چھوڑ کر وہ بہت سی دھرتیاں گھوم چکا تھا لیکن لکھنؤ جیسی چاشنی اسے کہیں نہ ملی تھی:

> ” او دیس میرے رہنے والے بتا! کیا امرّیوں میں اب بھی جھولے پڑتے ہونگے۔ لڑکیاں گاتی ہونگی_ اب کے ساون گھر آجا___ اور امبوا تلے ڈولا رکھدے۔۔۔ اب ہندوستان کی سرزمین پر اترتے ہوئے سمجھ میں آیا۔ کوئی اہم پیاری قیمتی شے ہمیشہ کے لیے کھو جائے اس کا کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ ہم نے وہ پرانا ہندوستان کھویا اور اپنی معصومیت کھوئی۔“(۱۶)

اس ناول کا عنوان مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷۔۱۸۶۹ء) کے ایک غیر متداول شعر سے لیا گیا ہے۔(۱۷)

قرۃ العین حیدر کا ساتواں اور آخری ناول **چاندنی بیگم** ۱۹۹۰ء تقسیم سے پہلے اور بعد کے تین گھرانوں کی چالیس پینتالیس برس کی کہانی ہے۔ تقسیم اور فسادات کی ہر بڑی میں بٹو بیگم کے سگے بھائی اسے بتائے بغیر سرحد پار پاکستان چلے جاتے ہیں:

> ” کیا بتلائیں بٹو بی ہم نے بہت منع کیا مگر مانے ہی نہیں۔ کہنے لگے فوجیں آمنے سامنے ٹھنی کھڑی ہیں۔ اس سے پہلے کہ راستے بند ہو جائیں ہم نے سمجھایا میاں یہاں جمے جمائے بیٹھے ہو مگر ان پر دھن سوار تھی۔ بڑے تو بیٹی کی چاہت میں گئے۔ بیاہ کرا تنی دور کوئٹہ بھیج دی۔۔۔ چھوٹوں نے کہا چلیے ہم بھی آپ کے ساتھ ہی چلے چلیں..... مجھے اطلاع تو کر دیتے۔ ایسے خون سفید ہوئے۔“(۱۸)

تقسیم کا اثر، اس ناول میں اتنا دکھائی دیتا ہے کہ قنبر علی کی تربیت کرنے والی اور خیر خواہ ماں تقسیم میں بھائیوں کے پاکستان چلے جانے کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے مر جاتی ہے۔ قنبر علی بے راہ روی کا شکار ہو کر اور گائیکہ بیلا سے شادی رچا کر گھر برباد کر لیتا ہے اور چاندنی بیگم محروم اور دکھی رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تینوں جل مرتے ہیں اور یوں بٹو بیگم کی جائیداد اور اکلوتے وارث کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بیشتر ناول تقسیم اور اس کے بعد کے لکھنؤ کے عکاس ہیں اور اعلیٰ طبقے کے افراد کی بدحالی کو موضوع بناتے ہیں۔ خود قرۃ العین بھی اسی طبقے سے تھیں اس لیے ان کے ناولوں میں یہی طبقہ غالب رہتا ہے۔ ان کے سبھی ناولوں کے مرکزی کردار تقسیم اور ہجرت کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے مطابق بٹوارا ہندو مسلمان کا نہیں بل کہ انسانیت اور صدیوں پرانی تہذیب کا ہوا جو انسانوں کے بٹوارے سے بھی سنگین ظلم ہے۔ دھرتی ماں پر خونی لکیر نے اس کے بچوں کو لہولہان اور اس کی تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) امجد طفیل، (مرتب)، قرۃ العین حیدر کے بے مثال ناولٹ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۱۲۔

(۲) علامہ محمد اقبال، کُلیاتِ اقبال اُردو – بالِ جبریل، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء)، ۳۵۶

(۳) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۲۹۹۔

(۴) قرۃ العین حیدر، سفینۂ غم دل، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۲۰۴۔۲۰۵۔

(۵) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا- دستِ صبا، (لاہور: مکتبہ کاروان، ۲۰۱۴ء)، ۱۱۶۔

(۶) جگر مرادآبادی، کُلیاتِ جگر، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ۲۷۵۔

(۷) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۳۰۱۔

(۸) ایضاً، ۳۱۷۔ (۹) ایضاً، ۴۷۹۔ (۱۰) ایضاً

(۱۱) امتیاز احمد، قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فکر و فن، (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۸ء)، ۱۲۔

(۱۲) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا۔ زنداں نامہ، ۲۴۵۔

(۱۳) قرۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہمسفر، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۳۴۵۔

(۱۴) قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۶۵۸۔

(۱۵) اقبال، علامہ محمد، کُلیاتِ اقبال اُردو – بالِ جبریل، ۳۴۷۔

(۱۶) قرۃ العین حیدر، گردشِ رنگِ چمن، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۴۲۵۔

(۱۷) جمال عبدالواحد (مدوّن)، غیر متداول کلامِ غالب، (نیو دہلی: غالب اکیڈمی، ۲۰۱۶ء)، ۴۸۔

(۱۸) قرۃ العین حیدر، چاندنی بیگم، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۱۹۔۲۰۔

BIBLIOGRAPHY

- Amjad Tufail, (Comp.), *Qurat-ul-Ain Ḥaider ke Bemisāl Novelette*, (Lahore: Al-Hamd Publications, 2014).
- Faiz Ahmad Faiz, *Nuskha-haye-Vafa –Dast-e Saba*, (Lahore: Maktaba Carvaan, 2014).
- Imtiaz Ahmad, *Qurat-ul-Ain Ḥaider: Shakhsiat aur Fikr-o-Funn*, (Patna: Khuda Bakhsh Oriental Public Liberary, 2008).
- Iqbal, Allama Muhammad, *Kuliyāt-e Iqbal* (Urdu), (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2018).
- Jamaal Abdul Wahid (Comp.), *Gher Mutadāvil Kalam-e Ghalib*, (New Delhi: Ghalib Academy, 2016).
- Jigar Muradabadi, *Kuliyāt-e Jigar*, (Delhi: Educational Publishing House, 2005).
- Qurat-ul-Ain Ḥaider, *Āg ka Darya*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2013).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Aakhir-e Shab ke Hamsafar*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2017).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Chandni Begum*, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Gardish-e Rang-e Chaman*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2014).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Kār-e Jahān Darāz Hae*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2017).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Merey Bhi Ṣanam Khanay*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2014).
- Qurat-ul-Ain Haider, *Safīna-e Gham-e Dil*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2008).

❖❖❖